(غلام گردش)

قریشی صاحب کا مسئلہ، پتہ نہیں کون حل کریگا؟

قریشی صاحب کا پورا نام کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔ شائد جاننے کی کوشش ہی نہیں کرسکا۔ آج تک ان سے ملاقات بھی نہیں ہے۔ کوئی ایک سال پہلے میرا لکھا ہوا کالم پڑھ کر قریشی صاحب نے ای میل کی۔ تحریر کے متعلق چند جملے درج تھے۔ عادت ہے کہ ہر ای میل کا خود جواب دیتا ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی قاری، کالم پڑھنے کا بعد، اس پر بات کرنے کیلئے وقت نکالتا ہے۔ تو تہذیب کا تقاضہ ہے کہ اسکا جواب یا کم ازکم شکریہ ادا کردیا جائے۔ شروع شروع میں کچھ غفلت ہوتی رہی۔ مگر اب باقاعدگی سے ای میلز کا جواب دیتا ہوں۔ دن میں اگر وقت نہ بھی ملے تو رات گئے، ای میل پڑھنے کے بعد شکریہ ضرور ادا کرتا ہوں۔

قریشی صاحب سے بھی اسی طرح لفظی بات چیت شروع ہوگئی۔ وہ ہر کالم پڑھنے کے بعد ای میل کرتے تھے۔ پھر شائد انہوں نے میرا فون نمبر حاصل کرلیا یا میں نے خود لکھ کر بھیج دیا۔ حقیقت میں بالکل یاد نہیں۔ پر چند ماہ سے ان سے گفتگو ہو رہی ہے۔ محسوس کیا کہ وہ ایک سنجیدہ انسان ہیں جو ملک کے حالات پر اَز حد پریشان نظر آتے ہیں۔ باتوں باتوں میں لگا کہ انہیں کرپشن کی ہوشربا داستانیں سنکر واقعی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک دن بتانے لگے کہ ستر برس کا ہوں۔ اسلام آباد میں رہتا ہوں۔ ذاتی چھوٹا سا مکان ہے۔ سرکار کی نوکری بھی کرتے رہے۔ ہماری حکومت سرکاری ملازم کا خون نچوڑ کر جب بے جان کردیتی ہے۔ تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ قلیل وسائل میں چھوٹا سا مکان بھی نہیں بنایا جاسکتا۔ ایک دن قریشی صاحب نے فون پر کہا کہ اسلام آباد میں کسی افسر کے دفتر گئے تھے۔ وہاں دفتر کی تزئین وآرائش ہو رہی تھی۔ فرش پر قیمتی ٹائلیں لگ رہی تھیں۔ قریشی صاحب کافی دیر تک کُڑھتے رہے کہ اتنے غریب ملک میں افسر اپنے دفاتر پر اتنا زیادہ سرکاری پیسہ کیوں خرچ کرتے ہیں۔ بار بار کہہ رہے تھے کہ اتنی بیش قیمت ٹائلیں لگانا فضول خرچی ہے۔ اس اصراف پر کوئی بولتا کیوں نہیں۔ کوئی بات کیوں نہیں کرتا۔ عجیب سا لگا کہ یہ بزرگ انسان دل میں اس ملک سے کتنی محبت رکھتا ہے کہ اسکی نظر میں دفتر کی تزئین بھی ایک معاشی جرم اختیار کرچکا ہے۔ ویسے دل ہی دل میں محسوس کیا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ سرکاری دفاتر مکمل طور پر فنکشنل طرز کے ہونے چاہیے۔ بالکل سادہ سے۔ کسی بھی تصنع کے بغیر۔ مگر جس ملک میں ہر چیز نمائشی ہو، وہاں سادگی اختیار کرنے کی بات کرنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں ہے۔ یہاں تو دفاتر اور سرکاری گھروں میں جا کر محسوس ہوتا ہے کہ اسکی شان وشوکت کے سامنے امریکی وائٹ ہاؤس بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے۔

ویسے مجھے وائٹ ہاؤس دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ امریکی صدر کا سرکاری گھر اور دفتر بے حد سادہ سا ہے۔ مسلمان رہنماؤں کی عادات کے برعکس کوئی سونے سے مزین فرنیچر موجود نہیں ہے۔ کوئی ہیرے جواہرات سے سجے قمقمے نہیں لگے ہوئے۔ وہی امریکہ کے عوامی رنگ۔ یعنی نیلا سا قالین۔ پرانے صدور کے مجسمے اور قدیم تصاویر۔ دوسری بات یہ کہ وائٹ ہاؤس کو دیکھنے کیلئے باقاعدہ اجازت دی جاتی تھی۔ یاد نہیں کہ ٹکٹ تھا کہ نہیں۔ مگر جب پہلی بار واشنگٹن گیا تو شوق سے دنیا کے سب سے طاقتور انسان کا گھر اور دفتر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھ کر کافی مایوسی سی ہوئی۔ کہاں ہمارے جیسے غریب اور قرضے پر چلنے والے ملک کے صدور اور سابقہ وزراء اعظم کے ٹھاٹ باٹھ اور محل

اور کہاں دنیا کی امیر ترین قوم کے صدر کا سادہ سا گھر اور دفتر۔ ویسے کیا آپ ہماری ذہنی پستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حال ہی میں سابقہ وزیر اعظم کے باتھ روم کی تصویر سوشل میڈیا پر شائع کی گئی۔ نہیں، غلط لکھ گیا ہوں۔ ٹی وی اور سرکاری میڈیا پر بھی دکھائی گئی۔ موصوف کا کموڈ سونے کا بنا ہوا تھا۔ پہلے مجھے یقین نہیں آیا۔ لگا کہ حسبِ روایت، سوشل میڈیا پر کوئی من چلا سابقہ وزیر اعظم کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔ مگر جب ٹی وی پر بھی دکھایا گیا اور پھر اخبارات میں بھی "سونے کے ڈبلیو سی" کی تصاویر دکھائی دی، تو دل ڈوب گیا۔ خدایا، یہ اصراف نہیں۔ یہ خرچہ نہیں۔ یہ سرکاری وسائل کو غرقاب کرنا نہیں۔ یہ کوئی شدید نفسیاتی اُلجھن کا شاخسانہ ہے۔ ذہنی پسماندگی کی پاتال ہے جہاں سے ایسے خیال جنم لیتے ہیں۔ بڑی خاموشی سے ایک ایک باتھ روم پر کروڑوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس مری کی آرائش پر شائد ستر کروڑ روپے خرچ کیے گئے تھے۔ ویسے یہ صرف ہمارے جیسے بدقسمت ملک میں ہی ہوسکتا ہے۔ جہاں ذرا سی پوچھ گچھ کی جائے، تو قیامت برپا کردی جاتی ہے۔ جمہوریت جمہوریت کی پکار سے آسمان لرز جاتا ہے۔ اپنے سیاہ کارنامے اور معاشی ڈاکے، انتہائی بھولی شکل بنا کر، نظام کے تسلسل کیلئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ عیاشی صرف اس فقیر ملک میں ہی ہوسکتی ہے۔ کسی مہذب اور ترقی یافتہ ملک کا صدر یا وزیر اعظم اگر اس طرح کا خرچہ کرے تو شائد ایک دن میں ہی پابند سلاسل ہو جائیگا۔

بہر حال بات قریشی صاحب کی ہو رہی تھی۔ اسی پر مرکوز رہنا چاہیے تھا۔ مگر انسانی خیال بھی عجیب چیز ہے۔ انسان کی تحریر کو، کہاں سے کہاں لیجاتا ہے۔ اصل موضوع سے ہزاروں نوری سال دور۔ ایک دن قریشی صاحب کا فون آیا تو ایسے لگا کہ بے حد افسردہ ہیں۔ جھجک کی بدولت پوچھ نہ سکا۔ انکی آواز میں پہلی جیسی چمک نہیں تھی۔ حد درجہ اُداسی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ انکی روح اور جسم، خزاں کے موسم میں داخل ہو چکا ہے۔ پوچھا تو لمحے کیلئے مکمل خاموشی چھا گئی۔ شائد میرا وہم تھا۔ محسوس ہوا کہ انکی آنکھوں میں آنسو ہیں اور رو رہے ہیں۔ فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ فون آیا۔ کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ میرا ایک مسئلہ ہے اور مجھے اسکا کوئی حل نظر نہیں آرہا۔ ذہن میں آیا کہ شائد کوئی گھریلو پریشانی ہو جسکے سبب قریشی صاحب کافی دلگیر ہیں۔ مگر انہوں نے ایک انتہائی ذاتی دکھ بیان کر دیا۔ انکی ایک ہی صاحب زادی ہیں۔ اس بچی کا نام مجھے معلوم نہیں ہے۔ ویسے ناموں کو یاد رکھنے کے معاملے میں کافی نااہل انسان ہوں۔ قریشی صاحب کا پورا نام نہیں معلوم تو بیٹی کا نام کیسے یاد ہوگا۔

قریشی صاحب کی آواز میں سوز تھا۔ بتانے لگے میری لڑکی ایم فِل کر چکی ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد نوکری تلاش کرنے لگی تو آزاد کشمیر کی میر پور یونیورسٹی میں لیکچرار کی سیٹ پر تعیناتی ہوگئی۔ ملازمت مکمل طور پر بغیر سفارش کے ملی۔ یہاں تک مجھے کوئی مسئلہ نظر نہیں آیا۔ مگر اصل مسئلہ یہ بتایا گیا کہ چار برس ہو چکے ہیں۔ بیٹی بلاناغہ روز بس پر بیٹھ کر اسلام آباد سے میر پور اور میر پور سے واپس آتی ہے۔ تین سو کلومیٹر ایک طرف اور اتنا ہی سفر دوسری طرف۔ یعنی روزانہ تقریباً چھ سو کلومیٹر کا سفر کرتی ہے۔ یونیورسٹی میں خاتون اساتذہ کیلئے ہوسٹل کی سہولت بھی موجود نہیں ہے۔ اکیلی لڑکی، میر پور شہر میں گھر لیکر بھی نہیں رہ سکتی۔ قریشی صاحب کہنے لگے کہ وہ منہ اندھیرے دھکے کھاتی ہوئی جاتی ہے اور رات گئے واپس آتی ہے۔ اسی دورانیہ میں بقول قریشی صاحب، وہ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ بچی خیریت سے واپس آجائے۔ نظر چوکھٹ پر جمی رہتی ہے۔ بار بار فون کرتے ہیں کہ بیٹی اب تم کہاں ہو۔ کہاں پہنچی ہو۔ کوئی مسئلہ تو نہیں۔ انکی آواز میں اب

آنسو بھی شامل تھے۔والد ہوں۔ایک ہی اولاد ہے۔حالات دیکھیے۔سڑکوں پر حادثات کی شرح دیکھیں۔لوگوں کے مزاج کو پرکھیے۔میری تو جان سارا دن سولی پر ٹنگی رہتی ہے۔کبھی زندہ ہوتا ہوں اور کبھی مرجاتا ہوں۔لگتا ہے کہ اعصاب ختم ہو چکے ہیں۔

میرا سوال تھا، کہ قریشی صاحب، بیٹی کی راولپنڈی یا نزدیک ٹرانسفر کے متعلق کوشش کیوں نہیں کی۔اُداس سا جواب دیا۔ہر دروازے پر صدا دی۔ہر بڑے بابو کے پاس گیا۔مگر کسی جگہ بھی میری مجبوری کو حل کرنے کیلئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔قریشی صاحب نے بڑے سوز سے کہا کہ آپ سرکاری افسر ہیں۔آپ ایسے کریں کہ وزیراعلیٰ سے بات کر لیجئے۔آپکی بات تو وہ مان ہی جائینگے۔سابقہ وزیراعلیٰ کی بات ہو رہی تھی۔میرا دل بیٹھ گیا۔سمجھ آ گئی کہ قریشی صاحب اپنی مجبوری کو مجھے حل کرنے کیلئے کہیں گے۔ایسے ہی ہوا۔معلوم نہ ہو پایا کہ میں کیا جواب دوں۔میرا جیسا ایک قلمی مزدور، محترم شہباز شریف جیسے بڑے آدمی کو کیسے کام کہہ سکتا تھا۔ویسے بھی سابقہ وزیراعلیٰ میرے لکھنے کی عادت سے خفا سے تھے۔ویسے تو وہ تقریباً ہر ایک سے شاکی تھے۔مگر مجھ پر انکی نظرِ عنایت کچھ زیادہ ہی تھی۔میں اپنی روایتی بے بسی میں قریشی صاحب کو یہ بتانے کی جرات نہ کر سکا کہ جناب میری تو دربارِ شاہی میں کوئی بھی رسائی نہیں۔بلکہ میں تو کسی بھی دربار کا حصہ نہیں ہوں۔میں تو فنا کے راستے کا مسافر ہوں۔جو اکیلا آیا تھا اور آبلا پا ہو کر بغیر سفر مکمل کیے تن تنہا ہی واپس چلا جائیگا۔قریشی صاحب سے عرض کی کہ وقت دیجئے۔کچھ کرتا ہوں۔پانچ چھ ماہ سے قریشی صاحب کا فون جب بھی آتا ہے تو میرا دل پھٹ جاتا ہے۔کیا جواب دوں۔کیا کہوں۔اگر یہ کہہ دوں آپکا کام نہیں کروا سکتا تو پتہ نہیں، قریشی صاحب کے دل پر کیا گزرے گی۔کیا وہ انکار سنکر زندہ بھی رہ پائینگے یا نہیں۔فون سنکر میں پھر قریشی صاحب سے دس پندرہ دن کی مہلت مانگ لیتا ہوں۔مگر انکا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔قریشی صاحب بے بس ہیں اور میں بے نوا ہوں۔شائد میرا یہ کالم کسی صاحبِ دل کی نظر سے گزر جائے اور اس غریب سے عام آدمی کا کام ہو جائے۔شائد، انکی بیٹی کی مصیبت ختم ہو جائے۔کالم لکھ کر میں بالکل اُداس ہو گیا ہوں۔بلکہ رنج واَلم سے شرابور ہو چکا ہوں۔عام آدمی کا اس ملک میں کوئی والی وارث نہیں۔قریشی صاحب کا مسئلہ پتہ نہیں کون حل کریگا؟

راؤ منظر حیات